سُنّت کی آئینی حیثیت

ایک اہم مراسلت

[ذیل میں وہ مراسلت درج کی جارہی ہے جو "بزمِ طلوعِ اسلام" کے ایک نمایاں فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مدیر ترجمان القرآن کے درمیان سنت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی ہے]

ڈاکٹر صاحب کا پہلا خط

مخدوم و محترم مولانا! دام ظلکم

السلام علیکم۔ دستوری تدوین کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ہر سچے مسلمان کی دینی امنگوں کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا آئین اسلام کی مستقل اقدار کی اساس پر ترتیب و تکمیل پائے۔ اس سلسلے میں آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں آپ اور دیگر حضرات کرام کا یہ متفقہ مطالبہ بھی سامنے آیا ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد "کتاب و سُنّت" پر ہونی چاہیے۔ مجھے نہ تو "سنت" کی حقیقی اہمیت سے مجالِ انکار ہے اور نہ اس کی اس اہمیت کو ختم کرنا مقصود۔ لیکن جب اسلامی آئین کی اساس کے طور پر "سنّت" کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایک اشکال ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے اور اس سے جو سوال اُبھرتے ہیں میں انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اوّلین فرصت میں اس اشکال کا حل تحریر فرمائیں گے۔ سوالات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) آپ کے نزدیک "سنت" سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہے اسی طرح سنّت (یعنی سنّتِ رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟

(۲) کیا (قرآن کی طرح) ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنّت رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو؟ یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟

(۳) کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کا متن؟

(۴) اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہ ہے یا نہیں؟

میں آپ کو یقین دلا دوں کہ جہاں تک اسلامی آئین کی ضرورت کا تعلق ہے میں قلب و نظر کی پوری ہم آہنگی سے اسے ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہوں۔ میری ان مخلصانہ گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی آئین کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام پسند ذہنوں میں اس کا ایک واضح، متفق علیہ اور ممکن العمل تصور موجود ہو تاکہ ملک کا لادینی ذہن جو پوری شدت سے اسلامی آئین کے خلاف مصروف کار رہتا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام پسند عناصر میں انتشار کی صورت پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

والسلام

نیاز آگیں عبدالودود

جواب

مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

عنایت نامہ مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۶۰ء وصول ہوا۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے ہیں۔ اس سے پہلے یہی سوالات دوسرے گوشوں سے آ چکے ہیں اور ان کا جواب بھی واضح طور پر میں دے چکا ہوں۔ ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار

دہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظر انداز کر دینا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔ اگر بالفرض آپ کے علم میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیے دیتا ہوں (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۰۹ تا ۲۲۰۔ و دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۰)۔ آپ انہیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے، اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں تو براہِ کرم میرے مذکورۂ بالا دونوں مضامین بھی بجنسہٖ شائع فرما دیں۔ کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط

مولانائے محترم! زید مجدکم

السلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اس کا علم ہے کہ اس قسم کے سوالات اس سے پہلے بھی کئی گوشوں سے کیے گئے ہیں۔ لیکن مجھے خاص طور پر استفسار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میری نظر سے ان سوالات کے ایسے جوابات آج تک نہیں گزرے جو متعین اور واضح ہوں۔

آپ نے اپنے جن مضامین کی نشاندہی فرمائی ہے میں نے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے بڑے افسوس سے یہ عرض کرنے دیجیے کہ ان سے بھی میرے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا بلکہ ان سے میری الجھن بڑھ گئی ہے۔ اس لیے کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔ بہر حال چونکہ میرا مقصد مناظرہ بازی نہیں (اور نہ آپ کے احترام کے پیش نظر میں

ایسی جرأت کر سکتا ہوں، بلکہ محض بات کا سمجھنا ہے۔ اس لیے جو کچھ میں آپ کے مضامین سے سمجھ سکا ہوں نیچے لکھتا ہوں۔ اگر میں نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے تو توثیق فرما دیجیے اور اگر غلط سمجھا ہے تو براہِ کرم اس کی تصریح کر دیجیے۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

(۱) آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے تیئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنت رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں:-

(ا) رسول اللہ (صلعم) نے اس تیئیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنت میں داخل نہیں۔

(ب) سنت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہ بہ تمام کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائیگا اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرف آخر نہیں۔ اصولِ روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہوگی جن میں علوم اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔

(۴) احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلامِ رسول ہیں جس طرح قرآن کی آیات، اللہ کا کلام۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

نیاز آگیں

عبدالودود

جواب

محترمی ومکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ مئی ۶۰ء ڈاک سے مل چکا تھا۔ اس کے بعد آپ نے دوبارہ ۲۸ مئی کو دستی بھی اس کی ایک نقل مجھے ارسال فرما دی۔ لیکن میں مسلسل مصروفیت کے باعث اب تک جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اپنے اس عنایت نامہ میں یہ یقین دلایا ہے کہ آپ کا مقصد اس مراسلت سے کوئی مناظرہ بازی نہیں ہے بلکہ آپ بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ جیسے شخص سے اسی چیز کا متوقع بھی تھا۔ لیکن جو طریقہ آپ نے اپنی مراسلت میں بات سمجھنے کے لیے اختیار فرمایا ہے وہ اس یقین دہانی کے ساتھ کچھ مطابقت رکھتا ہوا کم از کم مجھے تو محسوس نہیں ہوتا۔ آپ ذرا اپنا ۲۱ مئی کا خط نکال کر ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں آپ نے ۹ متعین سوالات میرے سامنے پیش کر کے ان کا جواب مانگا تھا۔ میں نے اسی تاریخ کو اس خط کے جواب میں آپ کو لکھا کہ آپ جنوری ۵۸ء اور دسمبر ۵۸ء کے ترجمان القرآن میں میرے فلاں فلاں مضامین ملاحظہ فرما کر" مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔" لیکن آپ نے ان مضامین کو ملاحظہ فرما کر اپنے ابتدائی سوالات کی روشنی میں ان پر کوئی کلام کرنے کے بجائے کچھ اور سوالات ان پر قائم کر دیئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ کیا واقعی یہی کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ ہے کہ ایک بحث کو طے کرنے سے پہلے دوسری بحث چھیڑ دی جائے اور بلا نہایت اسی طرح بات میں سے بات نکالنے کا سلسلہ چلتا رہے؟

آپ کے نئے سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ابتدائی سوالات کی طرف پلٹیں اور خود دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک کا میرے ان مضامین میں کیا جواب آپ کو ملا تھا اور آپ نے اس سے کس طرح گریز کیا ہے۔

سُنّت کیا چیز ہے؟ آپ نے چار سوالات اس بنا پر اٹھائے تھے کہ ہم نے آئین کمیشن کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے "اسلامی آئین کی اساس کے طور پر سُنّت کا ذکر کیا ہے"۔ دوسرے الفاظ میں آپ کے یہ سوالات سُنّت کی قانونی حیثیت سے متعلق تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا پہلا سوال یہ تھا:

"آپ کے نزدیک سُنّت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد قرآن ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟"

اس سے جو جوابات میرے مذکورۂ بالا مضامین میں آپ کے سامنے آئے وہ یہ ہیں:

"یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (SUPREME-LAW) ہے جو حاکمِ اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن، جو لفظ بلفظ خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، یا آپ کی سنت، جو قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ اس کے مقرر کیے ہوئے رہنما، حاکم اور معلّم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشا سمجھائیں، اس کے منشا کے مطابق افراد کی تربیت کریں، پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں، پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا یہ پورا کام، جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے انجام دیا، وہ سُنّت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانونِ برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے"

(ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء، صفحہ ۲۱۰ - ۲۱۱)

"یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی، ایک نیا نظامِ تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ، عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا؟ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر، حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہلِ ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغازِ اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امرِ واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص

سُنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوتِ قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیتِ نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت کو بطورِ خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضور کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔" (ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۱۶-۲۱۷)

اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے اس سوال کا جواب ملا یا نہیں کہ "سنت سے مراد کیا ہے"؟ اور آپ کو یہ معلوم ہوا یا نہیں کہ اسلامی آئین کی اساس کے طور پر جس سنّت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیے تھی کہ آیا آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ کس حیثیت میں تھا؟ اگر آپ کی رائے میں یہ کام کر دینے کے بعد آنحضرت صرف ایک مسلمان تھے عام مسلمانوں کی طرح، اور ان زائد از تلاوتِ قرآن اقوال و افعال میں آنحضرت کی حیثیت ایک نبی کی نہ تھی، تو صاف صاف یہ بات کہیے اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ یہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا قرآن سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ خدا کے مقرر کردہ ہادی، حاکم، قاضی، معلّم، مربّی کی حیثیت سے آنحضورؐ نے ایک مسلم معاشرہ تیار کرنے اور ایک ریاست کا نظام بنا کر اور چلا کر دکھانے کا جو کارنامہ انجام دیا اس میں آپ کی حیثیت ایک نبی کی حیثیت تھی تو یہ وہی سنت ہے یا نہیں جسے اسلام میں آئین کی اساس کا مرتبہ حاصل ہونا چاہیے؟ یہ بحث بعد کی ہے کہ اس سُنت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے اور کن پر نہیں ہوتا۔ پہلے تو آپ یہ بات صاف کریں کہ قرآن کے علاوہ "سنتِ رسول اللہؐ بحیثیتِ نبی" کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون مانتے ہیں یا نہیں؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ بنیادی بات جب تک صاف نہ ہو لے ان

ضمنی سوالات پر جو آپ نے اپنے دوسرے عنایت نامے میں چھیڑے ہیں، بحث کرنے کا آخر کیا فائدہ ہے۔

سنّت کس شکل میں موجود ہے؟

آپ کا دوسرا سوال یہ تھا کہ

"کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو، یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟"

اس سوال کا جو جواب میرے محوّلہ بالا مضامین میں موجود تھا، اور اگر آپ نے ان کو بغور پڑھا ہے تو آپ کے سامنے بھی وہ آیا ہو گا، اسے میں پھر یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جب نہیں تو اب آپ اسے ملاحظہ فرمالیں:

"سنت کو بجائے خود ماخذِ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کرونگا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابلِ انکار ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اُس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے، اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے، اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی امر اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔

دوسری تاریخی حقیقت، جو اتنی ہی روشن ہے، یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنتِ ثابتہ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظامِ حیات میں کسی جعلی طریقہ سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ سنت ان کے لیے قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوتے تھے اور ان کے گھروں سے لیکر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے، اس لیے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانہ سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسلٍ میراث میں ملے ہیں، اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معما ہے جس سے وہ آج یکایک دوچار ہو گیا ہے" (ترجمان القرآن۔ جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۱۸)

اسی مسئلے پر دوبارہ روشنی ڈالتے ہوئے میں نے اپنے دوسرے مضمون میں، جس کا حوالہ بھی میں پہلے آپ کو دے چکا ہوں، یہ لکھا تھا کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مربی، معلّم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لیکر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے، سکھاتے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں، اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و

وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر کیے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا۔ لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے۔ لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ، اور فتح پاکر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ* اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظامِ حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔

* جو اسلامی سلطنت کے ضابطے بن گئے

یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لیکر خاندان، منڈی، عدالت، ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور کی زندگی ہی میں عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لیکر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ پچھلی صدی تک تو ان ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے سے ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ان (سنتوں) کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن - دسمبر ۵۸ء - صفحہ ۱۶۷)

پھر اسی سلسلے میں آگے چل کر مزید تشریح کرتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا تھا:

"ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضور کی زندگی میں شہرت، اور رواجِ عام حاصل نہ ہوا تھا: جو مختلف اوقات میں حضور کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا۔ امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضور کی وفات

کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاء حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرۂ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اُس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایتِ حدیث کا نقطۂ آغاز ہے اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان منتشر سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنادی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی۔ جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا، ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پرواہ نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر ڈالتا۔ اسی لیے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی، اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا ردّ کر دی گئی ہے تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے ردّ و قبول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔" (ترجمان القرآن دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

اس جواب کو بغور ملاحظہ فرما لینے کے بعد اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے دوسرے سوال کا جواب ملا یا نہیں۔ ممکن ہے آپ اس پر یہ کہیں کہ تم نے "قرآن کی طرح ایک جامع و مانع کتاب" کا نام تو لیا ہی نہیں جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں" موجود ہو۔ مگر میں عرض کروں گا کہ میرے

اس جواب پر یہ اعتراض ایک کج بحثی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ ایک پڑھے لکھے ذی ہوش آدمی ہیں۔ کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ ایک معاشرے اور ریاست کا پورا نظام صرف ایک مدوّن کتابِ آئین (CODE) ہی پر نہیں چلا کرتا ہے، بلکہ اس کتابِ آئین کے ساتھ رواجات (CONVENTIONS) روایات (TRADITIONS) نظائر (PRECEDENTS) عدالتی فیصلوں، انتظامی احکام، اخلاقی ہدایات وغیرہ کا ایک وسیع سلسلہ بھی ہوتا ہے جو کتابِ آئین پر عملاً ایک نظامِ زندگی چلنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ چیز ایک قوم کے نظامِ حیات کی جان ہوتی ہے جس سے الگ کر کے محض اس کی کتابِ آئین نہ تو اس کے نظامِ حیات کی پوری تصویر ہی پیش کرتی ہے، نہ وہ ٹھیک طور پر سمجھی ہی جا سکتی ہے۔ اور یہ چیز دنیا میں کہیں بھی کسی "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں ہوتی، نہ ہو سکتی ہے، نہ ایسی کسی "ایک کتاب" کا فقدان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس قوم کے پاس اس کی کتابِ آئین کے سوا کوئی ضابطہ و قانون موجود نہیں ہے۔ آپ انگلستان، امریکہ، یا دنیا کی کسی اور قوم کے سامنے یہ بات ذرا کہہ کر دیکھیں کہ تمہارے پاس تمہارے مدوّن قانون (CODIFIED LAW) کے سوا جو کچھ بھی ہے سب ساقط الاعتبار ہے، اور تمہاری تمام روایات وغیرہ کو یا تو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہونا چاہیے ورنہ انہیں آئینی حیثیت سے بالکل ناقابلِ لحاظ قرار دیا جانا چاہیے، پھر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا یہ ارشاد کتنے وزن کا مستحق قرار پاتا ہے۔

کسی کا یہ کہنا کہ عہدِ نبوی کے رواجات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتّب شدہ ملنا چاہیے تھا، درحقیقت ایک خالص غیر عملی طرزِ فکر ہے اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے آج اِس زمانے کی حالت کو لے لیجیے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کے ذرائع بے حد ترقی کر چکے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اِس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۲۳ سال تک شب و روز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزارہا افراد کو اپنی تعلیم و تربیت

سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لیکر ایک پورے ملک کی فکری، اخلاقی تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔ اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک منتقل نمونۂ ہدایت بنی رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معاملات، غرض ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں بھی یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اس کا ریکارڈ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپّا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئات اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریریں سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار اشخاص کی رپورٹیں سب کی سب ناقابلِ اعتماد ہیں کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہرِ تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے، اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ وہ "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟

ان امور پر اگر بحث کی نیت سے نہیں بلکہ بات سمجھنے کی نیت سے غور کیا جائے تو ایک ذی فہم آدمی خود محسوس کر لیگا کہ یہ "ایک کتاب" کا مطالبہ کتنا مہمل ہے۔ اس طرح کی باتیں ایک کمرے میں بیٹھ کر چند نیم خواندہ اور فریب خوردہ عقیدت مندوں کے سامنے کر لی جائیں تو مضائقہ نہیں، مگر کھلے میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے ان کو چیلنج کے انداز میں پیش کرنا بڑی جسارت ہے۔

کیا سنت متفق علیہ ہے؟ اور اس کی تحقیق کا ذریعہ کیا ہے؟

آپ کا تیسرا سوال یہ تھا:

"کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح کہ قرآن کا متن؟"

اور چوتھا سوال یہ کہ:

"اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہ ہے یا نہیں؟"

ان سوالات کے جواب میں اپنے جن مضامین کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی تھی ان کو اگر آپ نے پڑھا ہے تو ان کے اندر یہ عبارتیں ضرور آپ کی نظر سے گزری ہونگی:

"بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوتے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام و ارشادات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہوگا تو امت کے اہل علم سے، یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوا لے گا۔ اور جو بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہوگی وہ بہرحال نہ چل

سکے گی۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہبِ فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکامِ قرآنی کی کسی تفسیر و تعبیر اور سننِ ثابتہ کے کسی مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کیا ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۵۸ء صفحہ ۲۱۹)

"اگر مختلف فیہ، سنت کا بجائے خود مرجع و سند (AUTHORITY) ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنتِ ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس۔ اے رحمان) نے خود قرآن مجید میں اختلافِ تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہٖ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے؟

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون داں سے، جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا جیلسیر،

یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکم رسول ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا، لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور رسول کو آخری سند (FINAL AUTHORITY) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانون واجب الاتباع ہے۔" (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۸ء۔ صفحہ ۱۶۲)

"سنتوں کا معتد بہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے، اور ایک حصے میں اختلافات ہیں بعض لوگوں نے کسی چیز کو سنت مانا ہے اور بعض نے اسے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہل علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ اُن لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبۂ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دُور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سُن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔" (ترجمان القرآن دسمبر صفحہ ۱۶۹)

میں نے آپ کے مذکورۂ بالا دونوں سوالات کے جواب میں ان عبارات کے مطالعہ کا مشورہ اس امید پر دیا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ ذی ہوش آدمی، جو بات سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو، انہیں پڑھ کر اپنی اُس بنیادی غلطی کو خود سمجھ لے گا جو اس کے سوالات میں موجود ہے، اور اس کی سمجھ میں آپ سے آپ یہ بات آجائیگی کہ سنت کی تحقیق میں اختلاف، اس کو آئین کی

بنیاد بنانے میں اسی طرح مانع نہیں ہو سکتا جس طرح قرآن کی تعبیر میں اختلاف اُسے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں ہے۔ لیکن آپ نے نہ اس غلطی کو محسوس کیا نہ بات سمجھنے کی کوشش فرمائی اور اُلٹے مزید کچھ سوالات چھیڑ دیے۔ میں آپ کے چھیڑے ہوئے ان سوالات سے تو بعد میں تعرض کروں گا۔ پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ اگر آپ کے نزدیک صرف وہی چیز آئین کی بنیاد بن سکتی ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس آسمان کے نیچے دنیا میں وہ کیا چیز ایسی ہے جو انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے بحث کرتی ہو اور اس میں انسانی ذہن اختلاف کی کوئی گنجائش نہ پا سکیں؟ آپ قرآن کے متعلق اس سے زیادہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کا متن متفق علیہ ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فلاں فقرہ قرآن کی آیت ہے۔ لیکن کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی کا منشا سمجھنے، اور ان سے احکام اخذ کرنے میں بے شمار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں؟ اگر ایک آئین کی اصل غرض الفاظ بیان کرنا نہیں بلکہ احکام بیان کرنا ہے تو اس غرض کے لحاظ سے الفاظ میں اتفاق کا کیا فائدہ ہوا جبکہ احکام اخذ کرنے میں اختلاف ہے، رہا ہے اور ہمیشہ ہو سکتا ہے؟ اس لیے یا تو آپ کو اپنے اس نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی ہو گی کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے"، یا پھر قرآن کو بھی اساسِ آئین ماننے سے انکار کرنا ہو گا۔ درحقیقت اس شرط کے ساتھ تو دنیا میں سرے سے کوئی آئین ہو ہی نہیں سکتا۔ جن سلطنتوں کا کوئی مکتوب آئین سرے سے ہے ہی نہیں (مثلاً برطانیہ) ان کے نظام کا تو خیر خدا ہی حافظ ہے، مگر جن کے ہاں ایک مکتوب آئین موجود ہے، ان کے ہاں بھی صرف آئین کی عبارات ہی متفق علیہ ہیں، تعبیرات ان میں سے کسی کی متفق علیہ ہوں تو براہِ کرم اس کی نشان دہی فرمادیں۔

اس کے علاوہ میری مذکورۂ بالا عبارات میں چند امور اور بھی ہیں جن سے آپ نے صرفِ نظر کر کے اصل مسائل سے پیچھا چھڑانے کے لیے دوسرے سوالات چھیڑ دیئے ہیں۔ لیکن میں اس راہِ گریز کی طرف آپ کو نہ جانے دوں گا جب تک اِن امور کے متعلق آپ کوئی متعین بات صاف صاف نہ کہیں۔ یا تو آپ ان کو سیدھی طرح تسلیم کیجیے اور اپنا موقف بدلیے۔ یا پھر محض دعووں سے نہیں

بلکہ کسی علمی دلیل سے ان کا انکار کیجیے۔ وہ امور یہ ہیں:

(۱) "سنتوں کا بہت بڑا حصہ امت میں متفق علیہ ہے۔" اسلامی نظامِ حیات کا بنیادی ڈھانچہ جن سنتوں سے بنتا ہے وہ تو قریب قریب سب ہی متفق علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ اصول اور کلیاتِ شریعت جن سنتوں پر مبنی ہیں ان میں بھی زیادہ تر اتفاق ہے۔ اختلاف اکثر و بیشتر ان سنتوں میں ہے جن سے جزئی احکام نکلتے ہیں۔ اور وہ بھی سب مختلف فیہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا بھی ایک اچھا خاصا حصہ ایسا ہے جن پر علماء امت کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔ صرف یہ بات کہ ان اختلافی مسائل کو بحثوں اور مناظروں میں زیادہ اچھالا گیا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ "سنت" پوری کی پوری مختلف فیہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سنتوں کے بڑے حصے کو متفق علیہ قرار دینے میں مانع نہیں ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے خبطی اور زیادہ تر بے علم گروہوں نے کبھی کہیں اور کبھی کہیں اٹھ کر متفق علیہ چیزوں کو بھی اختلافی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے گروہوں نے ایک سنت ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض تحریفِ قرآن تک کے مدعی ہوئے ہیں۔ مگر اس قسم کے چند سر پھرے اور کم سواد لوگوں کا وجود امتِ مسلمہ کے بحیثیتِ مجموعی اتفاق کو باطل نہیں کر سکتا۔ ایسے دو چار سو یا دو چار ہزار آدمیوں کو آخر یہ اجازت کیوں دی جاتے کہ پورے ملک کے لیے جو آئین بن رہا ہو اس میں سے ایک ایسی چیز کو خارج کر دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں جسے قرآن کے بعد ساری امت اسلامی قانون کی دوسری بنیاد مانتی ہے اور ہمیشہ سے مانتی رہی ہے؟

(۲) جزئی احکام سے متعلق جن سنتوں میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بھی یہ نہیں ہے کہ فرد فرداً ان میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہو بلکہ "دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہبِ فقہی پر مجتمع ہو گئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکامِ قرآنی کی کسی ایک تعبیر و تفسیر اور سننِ ثابتہ کے کسی ایک مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کر لیا ہے۔" مثال کے طور پر اپنے اسی ملک، پاکستان کو لے لیجیے جس کے آئین کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ قانون کے معاملہ میں اس ملک کی پوری مسلم آبادی صرف تین بڑے بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک حنفی۔

دوسرے شیعہ۔ تیسرے اہلِ حدیث۔ ان میں سے ہر ایک گروہ احکام قرآن کی ایک تعبیر اور سنن ثابتہ کے ایک مجموعہ کو مانتا ہے۔ کیا جمہوری اصول پر ہم آئین کے مسئلے کو اس طرح با سانی حل نہیں کر سکتے کہ شخصی قانون (پرسنل لا) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکامِ قرآن کی وہی تعبیر اور سنن ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے، اور ملکی قانون (پبلک لا) اُس تعبیر قرآن اور ان سنن ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے؟

(۳) بجائے خود بھی یہ سوال کہ "یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہ ہے یا نہیں"، درحقیقت کوئی لاینحل سوال نہیں ہے۔ جن سنتوں کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں، ان پر صدیوں اہلِ علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحبِ علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے"۔

(۴) پھر آئین اور قانون کی اغراض کے لیے اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ "قرآن کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے، یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ، لیجسلیچر، یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکم رسول ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے"۔

اب آپ خود ایمانداری کے ساتھ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ یہ امور جو میری محولہ بالا عبارات میں آپ کے سامنے آتے تھے، ان میں آپ کو اپنے تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب مل گیا تھا یا نہیں؟ اور ان کا سامنا کر کے ان کے متعلق ایک واضح بات نفیاً یا اثباتاً کہنے کے بجائے آپ نے دوسرے

سوالات چھیڑنے کی جو کوشش فرمائی ہے اس کی معقول وجہ، جس پر آپ کا ضمیر مطمئن ہو، کیا ہے؟

دوسرے خط کا جواب اس کے بعد میں آپ کے دوسرے عنایت نامے کو لیتا ہوں۔ اس میں آپ شکایت فرماتے ہیں کہ آپ کے پہلے خط کے جواب میں جن مضامین کی نشان دہی میں نے کی تھی ان سے آپ کو اپنے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا، بلکہ آپ کی الجھن اور بڑھ گئی ــــ لیکن اب آپ کے ان سوالات کے متعلق جو تفصیلی گزارشات میں نے پیش کی ہیں انہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ ان میں آپ کو ہر سوال کا ایک متعین جواب ملا ہے یا نہیں، اور ان سے آپ کی الجھن بڑھنے کا اصل سبب آیا ان مضامین میں ہے یا آپ کے اپنے ذہن میں۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہاری دوسری تحریروں سے مختلف ہیں ــــ اس کے جواب میں اگر میں یہ عرض کروں کہ براہ کرم میری اُن تحریروں کا حوالہ دیجیے اور یہ بتائیے کہ ان میں کیا چیزیں اِن مضامین سے مختلف ہیں، تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو گریز کا ایک اور میدان مل جائیگا۔ اس لیے بحث کے دائرے کو زیرِ بحث مسائل پر مرکوز رکھنے کی خاطر، یہ جواب دینے کے بجائے میں آپ سے عرض کروں گا کہ میری دوسری تحریروں کو چھوڑیے، اب جو باتیں میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کے متعلق فرمایئے کہ انہیں آپ قبول کرتے ہیں یا رد، اور اگر رد کرتے ہیں تو اس کے لیے دلیل معقول کیا ہے؟

چار نکات اس کے بعد آپ مجھے یہ یقین دلا کر کہ اس مراسلت سے آپ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں بلکہ بات کا سمجھنا ہے، میرے ان مضامین کا عطر چار نکات کی صورت میں نکال کر میرے سامنے پیش فرماتے ہیں اور مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو میں اس بات کی توثیق کر دوں کہ میرے ان مضامین کا عطر یہی کچھ ہے، یا یہ تصریح کروں کہ آپ نے ان مضامین کا مطلب غلط سمجھا ہے وہ نکات جو آپ نے عطر کے طور پر ان مضامین سے کشید کیے ہیں، ان پر تو میں ابھی مزید بحث کرتا ہوں، لیکن اس بحث سے پہلے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اپنے مضامین سے جو نکات میں نے اوپر نکال کر پیش کیے ہیں اُن کے مقابلہ میں اپنے اخذ کردہ اِن نکات کو رکھ کر آپ خود دیکھیں

اور فیصلہ کریں کہ جو ذہن اُن نکات کے بجائے اِن نکات کی طرف ملتفت ہوا ہے وہ بات کے سمجھنے کا خواہشمند ہے یا مناظرہ بازی کا مریض۔

نکتۂ اولیٰ آپ کا اخذ کردہ پہلا نکتہ یہ ہے:

"آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنتِ رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں:

(الف) رسول اللہ (صلعم) نے اس تئیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

(ب) سنت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔"

یہ خلاصہ جو آپ نے میرے کلام سے نکالا ہے اس کا پہلا جز ہی غلط ہے۔ میرے ان مضامین میں، جن سے آپ یہ خلاصہ نکال رہے ہیں، یہ بات کہاں لکھی ہے کہ "نبی اکرمؐ نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنتِ رسول اللہ کہتے ہیں"۔ میں نے تو اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی کا وہ پورا کام جو آپ نے ۲۳ سال میں انجام دیا، قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح ہے، اور یہ سنت قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے، اور یہ سارا کام چونکہ آنحضورؐ نے نبی کی حیثیت سے کیا تھا لہٰذا اس میں آپ اُسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن۔ اگر آپ دوسروں کی عبارتوں میں خود اپنے خیالات پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تو آپ کے سوال نمبر ۱ کے جواب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر خود دیکھ لیں کہ میں نے کیا کہا تھا اور آپ نے اسے کیا بنا دیا۔

پھر اس سے جو دو نتیجے آپ نے نکالے ہیں وہ دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ

آپ نے میری ان عبارتوں میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے بجائے ایک نئی بحث کا راستہ تلاش کیا ہے۔ کیونکہ نہ آپ کا پہلا سوال ان مسائل سے متعلق تھا، نہ میں نے اپنے اُن مخصوص مضامین کا حوالہ آپ کو اس لیے دیا تھا کہ آپ اِن مسائل کا جواب اُن میں تلاش کریں۔ تاہم میں آپ کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ آپ کے چھیڑے ہوئے سوالات کا جواب دینے سے میں نے گریز کیا ہے، اس لیے ان دونوں نتیجوں کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔

(الف) یہ بات مسلماتِ شریعت میں سے ہے کہ سنتِ واجب الاتباع صرف وہی اقوال و افعالِ رسول ہیں جو حضورؐ نے رسول کی حیثیت سے کیے ہیں۔ شخصی حیثیت سے جو کچھ آپ نے فرمایا یا عملاً کیا ہے وہ واجب التعظیم تو ضرور ہے مگر واجب الاتباع نہیں ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں باب بیانِ اقسامِ علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے اس پر مختصر مگر بڑی جامع بحث کی ہے۔ صحیح مسلم میں امام مسلم نے ایک پورا باب ہی اس اصول کی وضاحت میں مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے: باب وجوب امتثالِ ما قالہ شرعًا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرای (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف اُن ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرماتے ہیں نہ کہ اُن باتوں کی جو دنیا کے معاملات میں آنحضورؐ نے اپنی رائے کے طور پر بیان فرمائی ہیں)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضور کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق کر کے یہ فیصلہ آخر کون کریگا اور کیسے کرے گا کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے سنت واجب الاتباع کیا چیز ہے اور محض ذاتی و شخصی کیا چیز؟ ظاہر ہے کہ ہم بطور خود یہ تفریق و تحدید کر دینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضور نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت میں ہے۔ یا پھر جو اصولِ تشریعیت آنحضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں محتاط اہلِ علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے ....

کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو شخصی و ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے پر زیادہ تفصیلی بحث میں اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہوں جس کا عنوان ہے "رسولؐ کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی" (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

(ب) یہ نتیجہ آپ نے بالکل غلط نکالا ہے کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی شارح اس معنی میں ہے کہ "وہ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی"۔ اگر آپ اس کے بجائے "قرآن کے خلاف" کا لفظ استعمال کرتے تو نہ صرف میں آپ سے اتفاق کرتا بلکہ تمام فقہاء و محدثینِ امت اس سے متفق ہوتے۔ لیکن آپ "قرآن کے علاوہ" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کے معنی قرآن سے زائد ہی کے ہو سکتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ "زائد" ہونے اور "خلاف" ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سنت اگر قرآن سے زائد کوئی چیز نہ بتاتے تو آپ خود سوچیں کہ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ وہ قرآن کا وہ منشا واضح کرتی ہے جو خود قرآن میں صراحتاً مذکور نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم دیکر رہ جاتا ہے۔ یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔ اس غرض کے لیے سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان اور نماز باجماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں، اور جمعہ و عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت، اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن سے زائد ہے، مگر اس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح تمام شعبہائے زندگی میں سنت نے قرآن کے منشا کے مطابق انسانی سیرت و کردار اور اسلامی تہذیب و تمدن و ریاست کی جو صورت گری کی ہے وہ قرآن سے اس قدر زائد ہے کہ قرآنی احکام کے دائرے سے سنت کی ہدایات کا دائرہ بدرجہا زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہیں ہے، اور جو چیز بھی واقعی قرآن کے خلاف ہو اسے فقہاء و محدثین

میں سے کوئی بھی سنت رسول اللہ نہیں مانتا۔

اسی سلسلے میں آپ نے ایک اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "نہ سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے"۔ یہ بات آپ نے ایک غلط فہمی کے تحت لکھی ہے جسے صاف کرنا ضروری ہے۔ فقہائے حنفیہ جس چیز کو "نسخ الکتاب بالسنۃ" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اس سے مراد دراصل قرآن کے کسی حکمِ عام کو مخصوص (QUALIFY) کرنا اور اس کے ایسے مدعا کو بیان (EXPLAIN) کرنا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ مثلاً قرآن میں والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا (البقرہ۔ آیت ۱۸۰)۔ پھر سورۂ نساء میں تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے اور فرمایا گیا کہ یہ حصے متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں (آیات ۱۱-۱۲)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یہ فرما دی کہ اب وصیت کے ذریعہ سے کسی وارث کے حصے میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح اس سنت نے وصیت کی اجازتِ عام کو، جو بظاہر قرآن کی ان آیتوں سے مترشح ہوتی تھی غیر وارث مستحقین کے لیے خاص کر دیا، اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے وارثوں کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان میں کمی بیشی کرنے کے لیے وصیت کی اس اجازتِ عام سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسی طرح قرآن کی آیت وضو (المائدہ - ۶) میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا تھا جس میں کسی حالت کی تخصیص نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح علی الخفین پر عمل کر کے اور اس کی اجازت دے کر واضح فرما دیا کہ یہ حکم اُس حالت کے لیے ہے جبکہ آدمی موزے پہنے ہوئے نہ ہو، اور موزے پہننے کی صورت میں پاؤں دھونے کے بجائے مسح کرنے سے حکم کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس چیز کو خواہ نسخ کہا جائے، یا تخصیص، یا بیان، اس سے مراد یہی ہے، اور یہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور معقول چیز ہے۔ اس پر اعتراض کرنے کا آخر ان لوگوں کو کیا حق پہنچتا ہے جو غیر نبی ہونے کے باوجود قرآن کے بعض صریح احکام کو محض اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر "عبوری دَور کے احکام" قرار دیتے ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ عبوری دور جب ان کی

راستے نامبارک میں گزر جائے گا تو قرآن کے وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے!

نکتۂ دوم دوسرا نکتہ جو آپ نے میرے ان مضامین سے اخذ کیا ہے وہ یہ ہے:

"آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہ بتمام کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔"

یہ خلاصہ جو آپ نے میرے مضامین سے نکالا ہے اس کے متعلق میں بس اتنا ہی عرض کرونگا کہ اپنے خیالات میں مگن رہنے والے اور معقول بات سمجھنے سے انکار کرنے والے لوگ دوسروں کے کلام سے ایسے ہی خلاصے نکالا کرتے ہیں۔ ابھی ابھی آپ کے پہلے عنایت نامہ پر بحث کرتے ہوئے سوال نمبر ۱۰ پر جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اسے پلٹ کر پھر پڑھ لیجیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ میں نے کیا کہا ہے اور آپ نے اس کا خلاصہ کیا نکالا ہے۔

نکتۂ سوم آپ کا اخذ کردہ تیسرا نکتہ یہ ہے:

"آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائیگا۔ اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرف آخر نہیں۔ اصول روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائیگا۔ اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہوگی جن میں علوم اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔"

یہ جن عبارتوں کا عجیب اور انتہائی مسخ شدہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے انہیں میں بلفظہٖ یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہی اصل صورت میں سامنے آجائے اور اس کے من مانے خلاصوں کی حاجت نہ رہے:

"فن حدیث اسی تنقید یعنی تاریخی تنقید ہی کا دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر

تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (IMPROVEMENT) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کے اصولِ تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے ناقدینِ تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں بلا خوفِ تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جا نا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے۔ ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھیر سکے اور اس کو قابلِ تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جا سکے .... تاہم میں یہ کہوں گا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو پرکھنے اور جانچنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کیے ہیں وہ حرفِ آخر ہیں۔ آج اگر کوئی ان کے اصول سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی خامی یا کمی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لیے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائیگا۔ ہم میں سے آخر کون نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنتِ ثابتہ ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضور کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی، جس کا ذکر فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس اے رحمان) نے کیا ہے، ایک متفق علیہ چیز ہے ... ... البتہ اس سلسلے میں جو بات پیشِ نظر رہنی چاہیے، اور مجھے امید ہے کہ فاضل

مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہوگا، وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں، جن میں ایک مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو اور خاص طور پر جن کی عقل اسلامی نظامِ فکر و عمل کے حدود اربعہ سے باہر کے نظریات اصول اور اقدار لے کر اسلامی روایات کو ان کے معیار پر پرکھنے کا رجحان نہ رکھتی ہو۔ بلاشبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آئند پاکر قبول، اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پاکر رد کرنے لگیں، یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظامِ فکر و عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے رد و قبول کا کاروبار پھیلا دیں، تو مسلم ملت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اس ملت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل، یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلائے، کوئی تعمیری خدمت اس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی۔"

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۸ء صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۶)

ان عبارات سے آپ خود ہی اپنے نکالے ہوئے خلاصے کا تقابل فرمائیں۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ بات سمجھنے کی خواہش کا کتنا اچھا نمونہ آپ نے پیش فرمایا ہے۔

نکتہ چہارم | چوتھا نکتہ جو آپ نے خلاصے کے طور پر میرے مضامین سے نکالا ہے، یہ ہے:

"احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلامِ رسول ہیں جس طرح قرآن کی آیات اللہ کا کلام۔"

یہ ایک اور بے نظیر نمونہ ہے جو مناظرہ بازی کے بجائے بات سمجھنے کی خواہش کا آپ نے پیش

فرمایا ہے جس عبارت کا یہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص یا ادارے یا عدالت نے تعبیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکمِ خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکمِ خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا لیجسلیچر، یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے، وہی اس کے لیے حکمِ رسول ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے۔"

یہ عبارت اگرچہ میں پہلے نقل کر چکا تھا، لیکن تکرار کی قباحت کے باوجود میں نے اسے پھر نقل کیا ہے تاکہ آپ خود بھی اپنے جوہر (EXTRACT) نکالنے کے فن کی داد دے سکیں۔ اور اس اخلاقی جسارت کی داد میں اپنی طرف سے آپ کو دیتا ہوں کہ میری عبارت کو میرے ہی سامنے توڑ مروڑ کر پیش کر کے آپ نے واقعی کمال کر دکھایا ہے۔ میں شخصی طور پر آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں، اور ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا، مگر یہ شاید بزمِ طلوعِ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا۔

اشاعت کا مطالبہ آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے پہلے عنایت نامے کو آپ نے اس فقرے پر ختم فرمایا تھا:

"چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

میں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعتراض ہونا تو درکنار میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اس مراسلت کو جوں کا توں شائع فرما دیں۔ میں خود اسے "ترجمان القرآن" میں درج کر رہا ہوں۔ آپ بھی اس کو "طلوعِ اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں، تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ